R-No-2186/57

REGD-No.L 922

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

فون نمبر ۲۹
سالانہ قیمت ۵ روپے
فی کاپی ۱۵ پیسے

تاریخ ہائے اشاعت
۱-۸-۱۵-۲۲

جلد ۲۸ شمارہ ۱۶ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۲۲ اپریل ۱۹۶۹ء

اداریہ

اقبال کی یاد میں

اقبال کے انتقال کو اکتیس برس ہو گئے۔ ان کی زندگی میں اور ان کے انتقال کے بعد ان کی شہرت اپنے عروج پر تھی۔ وہ عام طور پر اردو کے بہت بڑے شاعروں میں شمار کئے جاتے تھے اور کچھ لوگ تو انھیں اردو کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کرتے تھے۔ آزادی کے فوراً بعد، ایک طرف پاکستان میں ان کی پرستش شروع ہوئی دوسری طرف ہندوستان میں ان کو نظر انداز کیا جانے لگا۔ لیکن آزادی کے بائیس سال کے بعد ہم اقبال کے متعلق زیادہ معروضیت کے ساتھ سوچ سکتے ہیں اور ان کی شاعری کے متعلق بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں کیونکہ اب ان کی شخصیت کے اور ہمارے درمیان وقت کا خاصہ فاصلہ ہو گیا ہے۔ ادب میں یہ فاصلہ بھی غیر جانبداری برتنے میں اور انصاف کرنے میں مدد دیتا ہے۔

اقبال اس ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کی پیداوار ہیں جس نے مغرب کے اثر سے ہمارے ملک میں ایک نئی مشرقیت کو جنم دیا۔ مغرب کے اثر کے بغیر ہم اقبال کو سمجھ نہیں سکتے۔ ان کی نئی مشرقیت کو ماضی پرستی کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا، یہ عصر حاضر سے ایک نئے مقابلے کی کوشش ہے۔ اکرام نے ٹھیک کہا ہے کہ اقبال کو اقبال مغرب نے بنایا۔ اقبال سنگھ نے اپنی کتاب پرجوش زائر میں اس اہم نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اقبال کو ایک کرب کے ساتھ حال کا احساس تھا۔ اس نئی مشرقیت میں اول اول قومیت کا ایک رومانی تصور تھا۔ مگر کیا پرجوش اور ولولہ انگیز تصور، اقبال سے اس کے ہمالہ، ترانۂ ہندی، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، تصویر درد، اور نیا شوالہ جیسی

نظمیں لکھوائیں۔ ان نظموں میں بڑے خلوص سے باہمی محبت کو سارے فرقہ وارانہ اختلافات کا حل بتایا گیا تھا۔ جب اقبال ۱۹۰۵ء میں یورپ پہنچے تو وہاں کے علمی حلقوں میں انیسویں صدی کی عقلیت اور سائنسیت کے خلاف بغاوت بڑھ رہی تھی اور یہ جذباتی بغاوت نیٹشے اور برگساں کی مقبولیت میں ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ ذہنی بغاوت جو مارکسیت کے فروغ میں ظاہر ہوئی اس کے بعد رونما ہوئی۔ اقبال نے یورپ میں جارحانہ قومیت اور سرمایہ دارانہ تمدن کے بہت سے رنگ دیکھے اور اس وجہ سے وہ نیٹشے اور برگساں سے متاثر ہوئے اور جارحانہ قومیت کے بجائے ایک ایسے اخلاقی نظام پر زور دینے لگے جو ساری دنیا کے لئے ہو۔ قدرتی طور پر اس نظام کے خط و خال انھیں اسلام میں نظر آئے اور اسی لئے یورپ سے واپس آ کر انھوں نے جہاں فلسفۂ خودی پر زور دیا جس کے ذریعے سے فرد اپنی شخصیت کی تکمیل کر سکتا ہے وہاں اس فرد کی خودی کو ایک اجتماعی نظام کی بے خودی سے ہم آہنگ کرنے کی بھی کوشش کی اور اس اجتماعی نظام کے لئے انھوں نے اسلام کے بنیادی تصورات سے کام لیا۔ چنانچہ بانگ درا کے تیسرے دور کی شاعری میں جہاں ان کے یہاں والدۂ مرحومہ کی یاد میں ایک ایسی نظم ملتی ہے جس میں حیات و موت کے فلسفے پر غور کیا گیا ہے اور زندگی کے تسلسل پر زور دیا گیا ہے، وہاں خضر راہ جیسی عہد آفریں نظم بھی سامنے آتی ہے جس میں اردو میں پہلی دفعہ سرمایہ و محنت کی آویزش اور پہلی جنگ عظیم کے پیدا کردہ مسائل پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ یعنی اس دور میں اقبال ایک ایسے شاعر کے روپ میں جلوہ گر ہوتے ہیں جو زندگی کا ایک بلند تصور رکھتا ہے جو حیات کے تسلسل کا قائل ہے، جو فرد کی شخصیت کی تکمیل پر زور دیتا ہے، جو عصر حاضر کے مسائل اور میلانات سے واقف ہے، اور جو زندگی کے لئے ایک جامع نظریے کی ضرورت محسوس کرتا ہے یہ کام اقبال سے پہلے دوسرے بڑے شاعر اپنے اپنے زمانے میں کرتے رہے ہیں کالی داس، دانتے، شیکسپیر، ملٹن،

گوئٹے بھی ایک آفاقی ذہن رکھتے تھے۔ قدرتی طور پر یہ کسی نہ کسی خاص مذہبی نظریے سے متاثر تھے۔ مگر ان کا ذہن آفاقی تھا۔ ان کے بلند تخیل اور گہرے تجربے نے اپنی اپنی زبان میں مناسب اور موزوں الفاظ کے ذریعے سے ایک مربوط، پیچیدہ اور محسوس صداقت کو پیش کیا تھا۔ یہی کام اپنے دور میں اقبال نے کیا۔ اقبال کی عظمت کے اعتراف کے لئے یہ قطعی ضروری نہیں ہے کہ ہم ان کے مذہبی نظریے سے اتفاق کریں۔ وہ اس مذہبی نظریے کی وجہ سے بڑے شاعر نہیں ہیں۔ وہ اس مذہبی نظریے کی وجہ سے بڑے شاعر کے درجے سے خارج بھی نہیں کئے جا سکتے کسی پرخلوص، گہرے، مربوط اور پیچیدہ تجربے کا اعتراف کرنے کے لئے اس تجربے سے اتفاق ضروری نہیں ہے۔ دانتے اور ملٹن اور گوئٹے کے مذہبی نظریات سے اتفاق کئے بغیر ہم ان کی عظمت کو تسلیم کر سکتے ہیں۔ اس طرح اقبال کی عظمت کے اعتراف کے لئے یہ کافی ہے کہ ان کے یہاں بلند تخیل، گہرا تجربہ، اپنے اس گہرے تجربے سے مکمل وفاداری اور اس کے اظہار کے لئے مناسب اور موزوں اظہار، یعنی استعاراتی اور علامتی اظہار ملتا ہے۔ اقبال نے فارسی میں بہت کچھ کہا، مگر بانگ درا کی چند نظموں کے علاوہ بانگ درا کی تقریباً ایک درجن نظمیں اور اتنی ہی غزلیں اور ضرب کلیم کی آدھی درجن نظمیں، اعلیٰ شاعری اور آفاقی شاعری کا ایسا نمونہ پیش کرتی ہیں جن پر اردو زبان فخر کر سکتی ہے۔ مسجد قرطبہ کی عظمت کا اعتراف کرنے کے لئے مسلمان ہونا ضروری نہیں۔ سرتیج بہادر سپرو نے اسپین میں لکھے گئے ان کے اشعار کے حوالے سے درست کہا تھا کہ یہ شاعری سب کے لئے ہے اس لئے آج ہمیں مذہبی اور سیاسی نظریات کی بنا پر شاعروں کی عظمت متعین نہیں کرنا چاہئے بلکہ ان کے یہاں پرخلوص اور گہرے تجربے اور اس تجربے کی صداقت اور پیچیدگی اور اس کے اظہار کی فنی خوبی پر نظر رکھنی چاہئے اقبال ایک آفاقی شاعر ہیں ان پر اردو زبان کو فخر ہے، مگر اس کے لئے ان کے سیاسی خیالات سے اتفاق ضروری نہیں، ان کے فن کے کمال اور فن کے ایک برگزیدہ اور جامع تصور کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ اقبال کی شاعری سے آج بھی ہمیں گرمی اور روشنی مل سکتی ہے ہاں یہ گرمی اور روشنی اظہار کے لئے آج کے سانچوں سے کام لے گی۔

قدیر لکھنوی کا انتقال

لکھنؤ۔ اردو کے ممتاز شاعر قدیر لکھنوی جن کا نام قدیر احمد خاں تھا، ایک طویل علالت کے بعد اپنی رہائش گاہ واقع بیرون خندق میں وفات پا گئے مرحوم کی عمر تقریباً اسّی سال تھی۔ مرحوم قدیر لکھنوی آج سے پچاس سال قبل لکھنؤ کے ان معدودے چند شعرا میں تھے جو "ینگ پارٹی" کہلاتے تھے اور ہندوستان کے طول و عرض میں ہونے والے مشاعروں میں قدیر صاحب اور ان کی پارٹی کے دوسرے ارکان سراج لکھنوی، آشفتہ لکھنوی، منظر لکھنوی، وغیرہ لکھنؤ کی نمائندگی کیا کرتے تھے۔ مرحوم کی وفات پر ادارہ ہماری زبان دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

دیوان غالب کا ایک اہم ترین مخطوطہ

قلمی کتابوں کا کاروبار کرنے والے ایک صاحب توفیق احمد چشتی قادری (مالک نیشنل بک ڈپو امروہہ ضلع مرادآباد) کو دیوان غالب کا ایک نہایت اہم مخطوطہ دریافت ہوا ہے یہ غالب کے اپنے قلم سے لکھا ہوا ہے اور اس میں نسخۂ حمیدیہ سے بھی پہلے کا کلام ہے یعنی اس مخطوطے کے اشعار کی اصلاح یافتہ شکل نسخۂ حمیدیہ میں ملتی ہے اس کے ورق الف پر "یا علی المرتضیٰ علیہ و علی اولادہ الصلوٰۃ والسلام" لکھا ہے، دوسری سطر پر

یا حسن بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یا حسین

سطر ۳ ابو المعانی میرزا عبدالقادر بیدل رضی اللہ عنہ

اس کے بعد دیوان شروع ہوتا ہے، پہلا شعر: نقش فریادی الخ

آخری ترقیمہ یہ ہے:

"تمت تمام شد بتاریخ چہاردہم رجب المرجب یوم سہ شنبہ سنہ ہجری (۱۲۳۱ھ) وقت دوپہر، روز باقیماندہ تحریر بیدل اسد اللہ خان عرف مرزا نوشہ متخلص بہ اسد عفی اللہ عنہ از تحریر دیوان حسرت عنوان خود فراغت یافتہ بہ فکر کاوش مضامین دیگر رجوع بہ جناب روح میرزا علیہ الرحمۃ آورد فقط"

اس سے ظاہر ہے کہ یہ سب سے پہلا مسودہ ہے۔ اس کے آخر میں فارسی اور اردو کی رباعیاں بھی ہیں نسخۂ حمیدیہ سے اختلافات ظاہر کرنے کے لئے صرف دو شعر لکھے جاتے ہیں۔

نسخۂ حمیدیہ سے

سر اختر شاں کی بہر استقبال آنکھوں سے   سویدا آتا بہ لب زنجیری دود سپند آیا

مخطوطہ

بہ استقبال تمثال بزمانہ اختر فشاں شوخی   سویدا تا بہ لب زنجیری دود سپند آیا

نسخۂ حمیدیہ

اسد خاک در میخانہ اب سر پہ اڑاتا ہوں   گئے وہ دن کہ پانی جام مے سے تا بزانو تھا

مخطوطہ

اسد خاک در میخانہ با بفرق پاشیدن   خوشا روزے کہ آب از ساغر مے تا بزانو تھا

میں نے یہ نسخہ دیکھا ہے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ غالب ہی کے قلم سے ہے۔ نسخۂ حمیدیہ اس کی ترقی یافتہ شکل ہے میرا اندازہ ہے کہ یہ مخطوطہ ۱۸۱۶ء کے لگ بھگ لکھا گیا ہے۔ امید ہے کہ غالب کے قدردان اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور توفیق احمد صاحب کو اس کے لیے مناسب معاوضہ دینے والی کوئی پارٹی سامنے آجائے گی تب اس کے مندرجات کی اہمیت زیادہ تفصیل اور وضاحت سے سامنے آسکے گی۔ (نثار احمد فاروقی)

اصغر عباس

انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی روشنی میں سر سید کی

صحافت کا ایک مختصر جائزہ

انیسویں صدی کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں اس لحاظ سے نہایت شاندار ہے کہ اس صدی میں یہاں بے شمار نامور مصلح ادیب شاعر مورخ اور انشا پرداز پیدا ہوئے لیکن ان سب کی خصوصیات اگر کسی ایک شخصیت میں سمٹ آئی تھیں تو وہ ذات صرف سر سید کی تھی اس لئے سر سید کو اگر جامع الصفات کہا جائے تو غلط نہ ہوگا

اس لحاظ سے ہم سر سید کی شخصیت کو بہ حیثیت صحافی بہ حیثیت محقق بہ حیثیت مورخ بہ حیثیت مضمون نگار اور بہ حیثیت شاعر تقسیم کر سکتے ہیں۔ ان سب میں سر سید کی صحافتی حیثیت سب سے زیادہ نمایاں ہے اور ان کی زندگی کے بڑے حصہ کا احاطہ کرتی ہے۔ اکیس برس کی عمر میں سید الاخبار میں کام کرنا شروع کیا۔ سرکاری طور پر اس اخبار کے ایڈیٹر سید عبد الغفور رہے تھے لیکن حقیقتاً اس کی ادارت کے فرائض سر سید اور ان کے بھائی سید محمد ادا کیا کرتے تھے حالی نے حیات جاوید میں اور منشی ذکاء اللہ نے رسالہ زمانہ کانپور میں لکھا ہے کہ فرضی طور پر بہ حیثیت مالک و ایڈیٹر سید عبد الغفور کا نام چھپا کرتا تھا مگر ادارت کا تمام کام اخبار کے اصلی مالک اور بانی سید محمد اور ان کے بھائی سر سید کیا کرتے تھے

۱۸۵۰ء میں یہ اخبار بند ہو گیا غدر کے ہنگاموں کے بعد سر سید نے موت کے سائے میں رسالہ اسباب بغاوت ہند لکھا ہی اس کے ساتھ ہی انھوں نے ایک رسالہ لائل محمڈنز آف انڈیا کے نام سے بھی نکالنا شروع کیا جس کے صرف تین نمبر نکل سکے۔

غدر کے واقعات نے سر سید کے دل میں قوم و ملک کی زبوں حالی کا شدید احساس پیدا کر دیا تھا لیکن اس شدت احساس کی بنا پر وہ جذباتیت کے شکار نہیں ہوئے بلکہ عقلیت سے قریب تر ہوتے گئے وہ قوم کا دکھ درد دور کرنا چاہتے تھے لیکن اس طرح نہیں جس طرح قوم چاہتی تھی بلکہ وہ چاہتے تھے کہ قوم اپنے علم و عمل کا خود احتساب کرے اور سر سید کا یہی نظریہ قوم کے دکھ کا واحد علاج تھا۔ اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لئے سر سید نے صحافت کو اپنا آلۂ کار بنایا اور اسی لئے صحافت نے ان کے لئے ایک خاص اہمیت اختیار کر لی۔ ان کی صحافت کی روح اس عنوان میں جلوہ گر ہے جو اخبار سائنٹیفک سوسائٹی کی پیشانی پر درج ہوتا تھا جس میں ان کا مطمح نظر بھی پوشیدہ ہے کہ جاری رکھنا چھاپہ کی آزادی کا کام ایک دانا گورنمنٹ کا اور برقرار رکھنا اس کا ہے کام ایک آزاد رعیت کا ان الفاظ میں ان کے اصول صحافت کا خلاصہ نظر آتا ہے جو آجکل تو قابل تعجب نہیں لیکن اس زمانے کی پر خطر فضا میں حیرت انگیز ضرور ہے یوں تو اخبار سائنٹفک سوسائٹی کے ایڈیٹروں میں منشی مہر یار خاں اور مولوی محمد اسمٰعیل کا بھی نام آتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت کو چھوڑ کر جس میں سر سید کا قیام علی گڑھ میں نہیں تھا اس کی ادارت کے فرائض سر سید ہی انجام دیتے تھے اخبار کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں انگریزی اور اردو دونوں میں مضامین ہوتے تھے سوا صفحے کے اس ہفتہ وار اخبار میں بیرونی اور مقامی مستند، اہم اور تازہ خبروں کے علاوہ بعض ممالک کے سیاسی تعلیمی معاشرتی حالات پر تبصرہ بھی ہوتا تھا اور جو خبریں تعلیم و تعلم سے متعلق ہوتی تھیں انھیں اہتمام کے ساتھ شائع کیا جاتا تھا۔ مذہبی بحثوں سے اس اخبار نے ہمیشہ احتراز کیا اور بقول مولانا حالی۔

"انھوں نے جتنے رفاہ عام کے کام کئے ان میں تمام ہندو مسلمانوں کو شریک کیا سوسائٹی کے اخبار میں جو تیس برس ان کے ہاتھ میں رہا کبھی بھول کر بھی کوئی آرٹیکل یا نوٹ ایسا نہیں لکھا جس سے کہ مذہبی تعصب کی بو آتی ہو ہمیشہ ہندو لیڈروں اور ریفارمروں کا ذکر ادب اور تعظیم کے ساتھ اپنے اخبار میں کیا۔" اس

سید سلیمان علی خاں

مناجات اقبال

(تضمین)

عہد حاضر کے لئے زنجیر پا دام خرد
کاسہائے آسمان رہبر و مہ جام خرد
عقل فکر آدمی ہے نا امید برگ و بر
ڈھونڈھتا ہے وہ خود اپنے واسطے تیر و تبر
علم کے ادراک میں اندیشہ ہائے تابناک
جیسے چشم تشنہ کو پانی نظر آئے سراب
علم حاضر اک تماشہ خانۂ افکار ہے
یا ان کفر کے ناچیز ذروں کا اک بازار ہے
بے تجلی سر و داناں کا جنوں خام ہے
نقش بند رنگ حیرت خانۂ ایام ہے
آدمی افلاک پر مصروف شب خوں ہے ابھی
در کشاکش قصر عالی شان گردوں ہے ابھی
شور تحقیق نوی سے پر ہے غوغائے حیات
اک سمندر بن گیا ہے تابش نور حیات
علم ہے محو تماشائے مقامات بلند
روح آدم تک مگر پہنچی نہیں اس کی کمند
اے خدا روزی کن آں روز سے مرا
دا [illegible] ریال [illegible] در بے سوز سے مرا

اخبار کے مخاطب ہندو، مسلمان اور انگریز ہوتے تھے پابندی اوقات کا عالم یہ تھا کہ وہ تیس برس برابر جاری رہا اس عرصہ میں شاید ہی کوئی نمبر ایسا ہو گا جو اپنی تاریخ معین پر نہ نکلا ہو۔

پہلی بار ۳۰ر مارچ ۱۸۶۶ء کو جب سائنٹفک سوسائٹی کے اخبار سائنٹفک سوسائٹی جس کا دوسرا نام علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ بھی تھا نکلا تو اس میں اخبار کے مقاصد کا بھی تذکرہ تھا ان مقاصد کا دائرہ بہت وسیع ہے مثلاً فرد اور جماعت کے اخلاق کی اصلاح تہذیب اور شائستگی قومی عزت کا احساس پیدا کرنا، ہندوستانیوں کو طرز فکر اور جمہوری طریقہ حکومت سے آشنا کرانا اور اردو کو قومی اور اجتماعی افکار و احساس کا ترجمان بنانا۔ یہی وہ اغراض و مقاصد ہیں جن کی تشریح و تصریح گزٹ کے ہر شمارے میں ملے گی۔

اخبار سائنٹفک سوسائٹی میں سب سے زیادہ اخلاق کی اصلاح کے سلسلے میں مضامین اور اداریے ملتے ہیں یہ مضامین مجلسی اخلاق و آداب کے مبلغ ہیں جس کا نمایاں مقصد ایک صحت مند زندگی کی تعمیر و تشکیل ہے۔ تہذیب و شائستگی کن اوصاف سے حاصل ہوتی ہے اس سلسلے میں مضامین کی ایک طویل فہرست ہے جس میں سچائی، تہذیب نفس، بے تعصبی، پابندی اوقات، صحت و صفائی پر بار بار مضامین اور اداریے ملتے ہیں مضمون نفاق میں دو رُوئی کی تفتیش اس طرح کی ہے۔

"دو رُوئی اس وصف کا نام ہے کہ ایک شخص اپنا ظاہر حال کسی وصف کے ساتھ آراستہ کرے اور باطن اور اوصاف کے ساتھ متصف ہو جس کے سبب سے بلکہ جس کے سرانجام کے واسطے قلب و لسان کا مخالف ہونا منجملہ ضروریات کے ہے پس حقیقت میں یہ ایک ایسا قبیح شیوہ ہے جو انجام کار ہمیشہ تذلیل و تفضیح کا باعث ہوتا ہے۔ ملک ہندوستان جو تمام دنیا میں مشہور ملک ہے اور جس کی صدہا باتیں قابل مدح ہیں اور جس کے آدمی بلاشبہ ہر قسم کے کمال کی استعداد رکھتے ہیں انھیں دو چار وصفوں کے سبب سے ایسا خراب ہے کہ اس کی تمام خوبیاں ان اوصاف کے سامنے بے اصل ہو گئی ہیں اور تمام ہندوستانی اس وجہ سے بے آبرو تصور کئے جاتے ہیں اور گو ہر شخص کی نسبت ایسا خیال نہ کر سکیں مگر چونکہ اکثر کا شعار یہی ہے اس نظر سے تمام خطہ ان کے ساتھ بدنام ہے۔"

یہ تو ایک حقیقت ہے کہ انگریزوں نے ہندوستانیوں کی تعلیم کی طرف جو توجہ کی اس میں کچھ اور ہی غرض پوشیدہ تھی جس کا اشارہ میکالے کے اس مشہور خط میں ملتا ہے جو اس نے اپنے باپ کو لکھا تھا۔ اس حقیقت کا احساس سرسید کو تھا اسی لئے انھوں نے ایک نئے تعلیمی نظام کی ضرورت محسوس کی چنانچہ انھوں نے اپنی توجہ کا سب سے بڑا مرکز اس کام کو بنایا اور تمام عمر اسی کام میں لگے رہے۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اخبار سائنٹفک سوسائٹی میں اصلاحی مضامین کے بعد سب سے زیادہ مضامین اور اداریے تعلیمی مسائل پر ملتے ہیں۔ اس زمانے میں جبکہ مردوں کی تعلیم کا مسئلہ ہی سخت نکتہ چینی کا سبب بنا ہوا تھا گزٹ میں تعلیم نسواں کی حمایت میں بھی مضامین ملتے ہیں چنانچہ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"ہر ملک کی کامل ترقی اور عمدہ تہذیب اسی حالت میں ہو سکتی ہے جب اس ملک کی عورتیں ورطۂ جہالت سے نکل کر لباس تربیت پہنیں اور جب تک کسی ملک کی عورتیں اپنی جہالت پر مستقل رہتی ہیں اس وقت تک وہ ملک کسی طرح اثر جہل سے محفوظ نہیں رہ سکتا اور اس ملک کے مرد پورے شائستہ نہیں ہو سکتے اور چونکہ ہندوستان میں عورتوں کی تعلیم کا دستور نہیں ہے اس وجہ سے یہ ملک بھی گویا پایۂ شائستگی سے گرا ہوا ہے پس چاہئے کہ تمام ہندوستانی اپنے ملک کی حالت پر رحم کھا کر عورتوں کی تعلیم کی جانب متوجہ ہوں"

اس اخبار میں سائنس، جغرافیہ، تاریخ اور معاشیات کے مبادیات پر بھی عام فہم زبان میں مضامین اور اداریے شائع ہوتے رہتے تھے تاریخ و زراعت سے سرسید کو خود بھی خاص دلچسپی تھی یہی وجہ ہے کہ معاشیات کی معتدبہ کتابیں سائنٹفک سوسائٹی سے ترجمہ ہو کر شائع ہوئیں اور زراعت کے سلسلے میں سرسید ان عملی تجربات میں حصہ لیتے تھے جو سائنٹفک سوسائٹی میں کئے جاتے تھے۔ خود انھوں نے نو قسم کے گیہوں لندن سے منگائے اور ایک ایک دانہ بونے کے لئے ایک آہنی آلہ ایجاد کی اور علم فلاحت پر ایک رسالہ بھی لکھنا شروع کیا جس کے بعض حصے گزٹ میں شایع ہوئے زراعت سے یہی دلچسپی تھی جس کی بنا پر اخبار میں انگریزوں کی معاشی استحصال کی شدید مخالفت کی جاتی تھی چنانچہ جب مانچسٹر کے تاجروں نے مطالبہ کیا کہ ان کے کپڑے کی ہندوستان میں درآمد پر ڈیوٹی ہٹا لی جائے تو اخبار نے لکھا کہ "ہندوستان کی دولت انگلستان کو کھنچی چلی جاتی ہے اور کل کے بنے ہوئے کپڑے کے تھان کے تھان بہت جلد سونا اور چاندی ہوئے جاتے ہیں مگر مانچسٹر والے روپیہ کو اس طرح پر کھنچے چلے جانے سے بھی راضی نہیں ہیں بلکہ وہ حتی الامکان اس سے بھی زیادہ نفع حاصل کرنا چاہتے ہیں اور ان کو اس بات کی کچھ بھی پرواہ نہیں ہے کہ ہندوستان دولت مند ہے یا غریب"

انگریزی زبان کے مقابلے میں اردو زبان کی حمایت اخبار کا محبوب موضوع رہا ہے اردو زبان میں تعلیم حاصل کرنے کے کیا فوائد ہیں اس سلسلے میں گزٹ کی دور بینی کا قائل ہونا پڑتا ہے کیونکہ آج سے ٹھیک سو برس پہلے گزٹ نے اس چیز کی بنیاد ڈالی تھی جس کی تکمیل پر ہم آج غور کر رہے ہیں چنانچہ ورنا کلر یونیورسٹی کے سلسلے میں گزٹ میں مضامین کا ایک سلسلہ ملتا ہے ایک اداریے سے ایک اقتباس دیکھئے۔

۔۔۔ اردو ہندوستانی لڑکے کی طبیعت کے موافق اس طرح پر ہے جیسی کہ انگریزی انگریز لڑکے کے واسطے ہے اردو ایک ایسی قلمی نہیں ہے کہ اس میں غیر ملک کی آب وتاب ہو بلکہ مادہ اس کا اس کے اصلی ملک ہندوستان کی پیدائش ہے اس زبان میں حسب عادت کام کرنے اور سوچ بچار کرنے اور لکھنے اور پڑھنے سے اسی ڈھنگ اور طریق پر دل رہتا ہے جس میں بعد اختتام تحصیل مدرسہ کے چلنا یا ترقی کرنا اس کو ضرور ہوتا ہے اور دیسی زبان کے ذریعہ سے جو تعلیم ہم چاہتے ہیں وہ تمام قوم کے تمام کاموں میں آمیز ہو جاوے گی اور اس کے ذریعہ سے شائستگی اور مفید علم کی بنیاد ہندوستان میں ہمیشہ کے واسطے قائم ہو جاوے گی اور اگر تعلیم سے کبھی ایک غرض ہے تو رفتہ رفتہ خود اس کے ذریعہ سے ہندوستانیوں میں بھی ملٹن صاحب اور ایڈیسن صاحب خود پیدا ہو جاویں گے"

محمد نثار الرحمن خان منتاز

تضمین بر کلام اقبال

اے ادیب نکتہ سنج و شاعر شیریں نوا
اہل فن میں تجھ کو حاصل ہے نرالا مرتبہ
عالم انسانیت کو ناز ہے تجھ پر بجا
"فکر انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پر مرغ تخیل کی رسائی تا کجا"

تیرے فن پاروں کی دنیا حسن سے معمور ہے
تیری ہر تخلیق میں بے تاب برق طور ہے
ندرت فکر و نظر تیری بہت مشہور ہے
"دیدہ تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے
بن کے سوز زندگی ہر شے میں جو مستور ہے"

گلشن شعر و ادب ہے تیرے دم سے پربہار
تیرے ہاتھوں بڑھ گیا رنگ تغزل کا نکھار
تیرا فیضان کرم ہے درحقیقت بے شمار
"محفل ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار
جس طرح ندی کے نغموں سے سکوت کوہسار"

کیا عجب خوبی ہے تیری فکر کی تنویر میں
کیسے کیسے دل ہوئے ہیں قید اس زنجیر میں
آئے دن کیوں نہ اضافہ ہو تیری توقیر میں
"زندگی مضمر ہے تیری شوخی تحریر میں
تاب گویائی سے جنبش ہے لب تصویر میں"

جاذب قلب و نظر ہے تیرا فن تیرا ہنر
نذر فن تو نے کئے خون دل و خون جگر
کیوں نہ رکھے تیرا ہر اک قول جادو کا اثر
"نطق کو سو ناز ہے تیرے لب اعجاز پر
محو حیرت ہے ثریا رفعت پرواز پر"

تیری ہر تحریر میں سوز دروں تپیدہ ہے
جوہر فن تیرے ہر شعر میں پوشیدہ ہے
تیرے انداز بیاں کا ہر سخنور گرویدہ ہے
"آہ تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشن ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے"

تیرا دیواں خاتم اردو میں ہے مثل نگیں
محو حیرت جس سے ہو جاتی ہے چشم نکتہ بیں
ہے ترا طرز سخن طرز ادا کتنا حسیں
"لطف گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں
ہو تخیل کا نہ جب تک فکر کامل ہم نشیں"

آج یوں اردو غزل کا ہر کوئی دیوانہ ہے
ہر زباں پر اس کے لطف حسن کا افسانہ ہے
پھر بھی اس گلشن میں اردو سبزہ بیگانہ ہے
"گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائی دلسوزی پروانہ ہے"

اخبار ہندوستانی صحافت کے وقار کی حفاظت بھی اپنا فرض سمجھتا تھا چنانچہ جب انگریزی اخبارات اردو اخباروں پر نکتہ چینی کرتے تھے تو گزٹ ان کا بھرپور جواب دیتا تھا اس سلسلے میں اس کا ایک اداریہ ملاحظہ ہو۔

"انگریز اخبار نویس ہندوستان میں اس قدر کسی فرقے سے ناراض نہیں ہیں جس قدر کہ وہ ہندوستانی اخباروں کی آزادی سے اسی وجہ سے انھوں نے کبھی ہندوستانی اخبار پر خوشامد کا الزام لگایا ہے کبھی بغاوت کا الزام ثابت کیا ہے کبھی ہندوستانی راجاؤں کی جھوٹی خوشامد کا خیال خام لگایا ہے مگر ہم خوب جانتے ہیں کہ یہ الزام ان کی اس قلبی حرارت سے پیدا ہوئے ہیں اور ہر چند وہ اپنے ایسے خیالات کو نہایت خوبصورت صورت میں ظاہر کرتے ہیں مگر اس قوی حرارت کے سبب سے ایک نوع کی سوختگی اس اچھی صورت پر بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔"

چنانچہ یہی وجہ تھی کہ ۱۸۶۶ء کی ہندوستانی اخباروں کی جو رپورٹ گورنمنٹ نے شائع کی تھی اس میں گزٹ کی آزادی پر کڑی تنقید کی

(باقی صفحہ ۔۔ پر)

شریف الحسن عثمانی

گلدستہ سخن سنج لکھنؤ

گلدستۂ سخن سنج حکیم محمد سراج الحق صاحب نے لکھنؤ سے ۱۹۱۷ء میں نکالا تھا حکیم سراج الحق قصبہ باڑی ضلع سیتاپور کے رہنے والے تھے شرر لکھنوی کے سسرال رشتہ دار تھے اور دلگداز رسالے کے منیجر تھے سخن سنج بھی دلگداز پریس سے شائع ہوتا تھا۔ سخن سنج سہ ماہی رسالہ تھا اس کا حجم دو جز تھا ایک جز میں نثر دوسرے جز میں شعراء کی غزلیں ہوتی تھیں۔ رسالہ دلگداز ماہ نومبر ۱۹۱۶ء میں اس کا اشتہار ضمیمہ کے طور پر شائع ہوا ہے اس میں تحریر ہے۔

"پہلے رسالہ کے حصہ نثر میں مولٰنا مولوی محمد عبدالحلیم صاحب شرر کی لکھی ہوئی "قرۃ العین" کی مکمل سوانح عمری ہوگی اور حصہ نظم میں مشہور شعراء کی غزلوں کا انتخاب درج ہوگا اکثر اوقات کوئی مصرعہ طرح بھی دیا جائے گا سالانہ چندہ ملک کی حالت دیکھتے ہوئے برائے نام مع محصول ڈاک صرف ایک روپیہ چار آنہ رکھا گیا ہے اور دل افروز یا مورخ کے خریداروں کو صرف ایک روپیہ کے ٹکٹ وصول ہو جانے پر انھیں دونوں رسالوں کے ساتھ ساتھ سال بھر تک یہ رسالہ بھی پہونچتا رہے گا مزید براں جو صاحب رومتہ الکبریٰ (جو مولٰنا شرر مدظلہ کا مشہور تاریخی ناول ہے اور جس کی قیمت عہ ہے) کی خریداری فرمائیں گے ان کی خدمت میں یہ رسالہ بلا قیمت سال بھر تک جاری رہے گا نمونے کے واسطے ۱ر کے ٹکٹ اور جواب طلب امور کے واسطے جوابی کارڈ آنا چاہئے"

رسالہ کے سرورق پر قواعد اس طرح درج ہیں۔

۱۔ اس رسالے میں نظمیں اور نثر مضامین ہوا کریں گے اور ہر سہ ماہی میں ایک بار شائع ہوتا رہے گا۔
۲۔ خریدار و غیر خریدار سب کا منتخب کلام شائع ہوگا
۳۔ سات شعر سے زیادہ منتخب نہ ہوں گے اور ہر صاحب خود انتخاب کرکے اپنا کلام بھیجیں تو بہت مناسب ہے۔
۴۔ اہل شہر سے سالانہ چندہ (۱۴ر) اور بیرون جات سے (۶ر) لیا جائے گا۔
۵۔ بغیر جوابی کارڈ یا ٹکٹ کے ہم جواب دینے پر مجبور نہ ہوں گے۔
۶۔ نمونے کے واسطے ۱ر کا ٹکٹ آنا لازمی ہے۔
۷۔ معاونین کرام جو کچھ عنایت فرمائیں گے شکریہ کے ساتھ قبول کیا جائے گا۔

سب سے پہلا رسالہ جنوری ۱۹۱۷ء میں شائع ہوا دوسرا شمارہ اپریل میں تیسرا شمارہ جولائی میں اور چوتھا شمارہ اکتوبر ۱۹۱۷ء میں شائع ہوا یہ سال کا آخری پرچہ تھا اس میں ایڈیٹر نے "ضروری التماس" کے عنوان سے لکھا ہے

"سخن سنج کا سال ختم ہوگیا اور سال کا یہ آخری پرچہ آپ کے ہاتھ میں ہے اس کا فیصلہ کہ یہ اچھا ہے یا برا آپ خود کرسکتے ہیں میرے نزدیک تو ہر پہلو سے کامیاب رہا بہت سے دوستوں کا اصرار ہے کہ یہ رسالہ ماہوار کردیا جائے مگر یہ دشوار ہے اول تو ہمیں زیادہ فرصت نہیں دوسرے پابندی کی ضرورت ہے اور یہ ہم سے غیر ممکن ہے اور جب پابندی نہ ہوسکی تو ماہوار ہونا یا سہ ماہی ہونا برابر ہے بلکہ بہ لحاظ پابندی سہ ماہی کو فضیلت ہے .... کاغذ سیاہی کی گرانی سے بڑا نقصان پہونچا رہی ہے لیکن ان زحمتوں کے برداشت کرنے کے لئے انشاء اللہ ہم ہمیشہ تیار رہیں گے مگر شعراء کی مہربانی نے حجم بڑھانے پر مجبور کردیا ہے اور ایک جز کا اضافہ کیا جاتا ہے اس کے لحاظ سے رسالہ ہذا کا چندہ بجائے ۱۴ر معہ محصول ڈاک کے ۲ر معہ محصول مقرر کیا جاتا ہے اور خریداران دل افروز و مورخ سے ۱ر سالانہ لے جائیں گے۔"

میرے پاس ۱۹۱۷ء کے مکمل اور اکتوبر ۱۹۲۰ء تا جنوری ۱۹۲۱ء کے رسائل ہیں مولانا شرر کے دو مضامین قرۃ العین و تیری ملکہ بھی ان میں شائع ہوئے ہیں۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء کا پرچہ ۳۲ صفحات کا بجائے صرف ۲۴ صفحوں کا شائع ہوا اور اس میں حصہ نثر نہیں ہے معروف و غیر معروف شعراء حصہ نظم میں نظر آتے ہیں جن شعراء کا کلام تقریباً ہر شمارہ میں شائع ہوا ہے وہ علامہ ڈاکٹر اقبال، اکبر الہ آبادی، حسرت موہانی، نظم طباطبائی، وحشت کلکتوی، جلیل مانک پوری، ریاض خیرآبادی، شوق قدوائی، عزیز لکھنوی، آزاد سبحانی، یاس عظیم آبادی (یگانہ چنگیزی)، آرزو لکھنوی، صفی لکھنوی ظریف لکھنوی، خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی، واقف بسوانی، کوثر خیرآبادی، جگر بسوانی، باسط بسوانی، رضا علی، دل شاہجہاں پوری، بیخود موہانی، شاد لکھنوی، نواب سائل دہلوی، منور لکھنوی اور صفدر مرزاپوری ہیں۔

جولائی ۱۹۱۷ء میں طرحی غزلیں شائع ہوئی ہیں مصرع

طرح تھا ۔ "بیمار الم کو نہیں امید سحر کی" اس محفل میں ، اچھو ، خورشید اور نور شاعرات بھی شریک ہیں لیکن سب لکھنؤ کی طوائفیں ہیں۔ بی اچھو جان اچھو کے اشعار ملاحظہ ہوں سے

ہے دور قدح پیر مغاں دور تسلسل
رندوں کے لئے قید نہیں شام و سحر کی
سن کر مرے نالوں کو وہ دل تھام کے بیٹھے
دل دوز صدا ہے یہ مری سوختہ جگر کی

بی خورشید جان خورشید فرماتی ہیں سے

بکھری ہوئی زلفوں کے اثر میں ہے رخ یار
اس شام کے پردے میں ہے تصویر سحر کی
یہ بانکی ادا یار کی یہ شوخ نگاہیں
اک پھانس مرے دل کی ہے اک پھانس جگر کی

بی نور جہاں نور کے اشعار ہیں سے

یکساں ہے جفا سب پہ ترے تیر نظر کی
جو دل کا ہے عالم وہی حالت ہے جگر کی
اک ہم ہیں کہ ہوگئے نذر شب ہجر میں تم کو
اک تم ہو کہ دشمن کے یہاں رہ کے سحر کی

اپریل کے ۱۹۱۷ء کے شمارہ میں "جذبات دل" کے عنوان سے نظمیں ہیں "ترنم دلکش" کے عنوان سے غزلیں شائع ہوئی ہیں اس میں مرزا غالب و مولانا شبلی کی ایک ایک غیر مطبوعہ غزل ہے جو ایڈیٹر کو منشی حشمت حسین صاحب صابری و منشی حمید حسن صاحب کی معرفت حاصل ہوئی تھیں۔

غزل مولانا شبلی مرحوم

یاد کو رغبت اغیار نہ ہونے پائے	گل تر کو ہوس خار نہ ہونے پائے
اس میں درپردہ سمجھتے ہیں وہ اپنا ہی گلہ	شکوۂ چرخ ستمگار نہ ہونے پائے
فتنۂ حشر جو آنا ہے تو آئے لیکن ذرا	بخت خفتہ مرا بیدار نہ ہونے پائے
باغ کی سیر کو جاتے تو ہو پر یاد رہے	سبزہ بیگانہ ہے دوچار نہ ہونے پائے
جمع کر لیجئے غمزوں کو مگر خوبی بزم	بس وہیں تک ہے کہ بازار نہ ہونے پائے
ہائے دل کھول کے کچھ کہہ نہ سکے سوز دروں	کہئے ہم عرض بغا رنہ ہونے پائے
آپ جاتے تو ہیں اس بزم میں لیکن شبلی	حال دل دیکھئے اظہار نہ ہونے پائے

غزل مرزا غالب مرحوم

ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
میں دشت غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں
ہوں دردمند جبر ہو یا اختیار ہو
گہ نالہ کشیدہ گہ اشک چکیدہ ہوں
جاں لب پہ آئی تو بھی نہ شیریں ہوا دہن
از بسکہ تلخی غم ہجراں چشیدہ ہوں
نے سبحہ سے علاقہ نہ ساغر سے واسطہ
میں معرض مثال میں دست بریدہ ہوں
ہوں خاکسار پر نہ کسی سے ہے مجھ کو لاگ
نے دانہ فتادہ ہوں نے دام چیدہ ہوں
جو چاہئے نہیں وہ مری قدر و منزلت
میں یوسف بہ قیمت اول خریدہ ہوں
ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ
ہوں میں کلام نغز ولے ناشنیدہ ہوں
اہل ورع کے حلقے میں ہرچند ہوں ذلیل
پر عاصیوں کے زمرے میں میں برگزیدہ ہوں
پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

اکتوبر ۱۹۲۰ء کا رسالہ تین جز کا ہے دو جز میں غزلیات میں ایک جز میں نثر ہے جنوری ۱۹۲۱ء کا رسالہ صرف چالیس صفحات کا ہے جس میں غزلیات اور سو میں نثر ہے دونوں شماروں میں سے چند مزاحیہ اشعار ملاحظہ ہوں سے

ظریف لکھنوی

ہجر کی گھڑیاں گنا کرتے ہیں عاشق رات دن
یہ حسیں معشوق بنتے بنتے گھنٹہ گھر بنے
لے کے علم عالم اگر ساری کتابیں چاٹ جائے
آدمی تو بن نہیں سکتا وہی جھینگر بنے
شاعری بیکار شئے ہے اس زمانہ میں ظریف
نام کی خواہش جسے ہو قوم کا لیڈر بنے

محمد احمد علی خاں شوقی

مجھ پر گمان قوم فروشی نہ کیجئے	فضل خدا سے خان بہادر نہیں ہوا ہوں میں
میں نے جو اس سے شکوہ جور و جفا کیا	کہنے لگا وہ شوخ کہ ڈاکو نہیں ہوں میں
تجھ کو تو ہوں میں انجمن قوم و دل کا	یہ بات دوسری ہے کہ ممبر نہیں ہوں ابھی تک
اشعار میرے سن کے عجب طنز سے کہا	بندہ نواز حضرت اکبر نہیں ہوں میں

گلدستہ سخن سنج پر معاصر اخبارات و رسائل نے ریویو عمدہ الفاظ میں کیا ہے رسالہ النظامیہ رقمطراز ہے۔

"سخن سنج نام ایک ماہی رسالہ زیر ادارت جناب مولوی حکیم محمد سراج الحق صاحب منیجر دلگداز پریس سے شائع ہونا شروع ہوا ہے خود حکیم صاحب اصول ادارہ ترتیب اخبار سے خود واقف ہیں اور پھر جناب شمس العلماء مولانا محمد عبدالحلیم صاحب شرر اس کے سرپرست ہیں اس سے توقع ہے کہ یہ رسالہ خوب چلے گا ضرورت تھی کہ لکھنؤ سے ایک خالص ادبی پرچہ بڑے پیمانے پر نکالا جائے ہم کو امید ہے کہ یہ رسالہ ترقی کر جائے گا تو ادبی ضرورتوں کو بہت کچھ پورا کرے گا رسالے کے نظم و نثر دونوں حصے دلچسپ ہیں"

یہ گلدستہ کب تک جاری رہا اس کی تفصیل مکمل طور پر معلوم نہ ہو سکی بہر حال لکھنؤ کا یہ آخری گلدستہ ہے۔

مراسلات

غالبیہ

غالب کے سلسلے میں جس قدر کام ہو چکے ہیں ان کے سوا ابھی بہت سے ایسے کام سرانجام دینے ہیں جو اپنی افادیت کے اعتبار سے اہم ہیں اور جن کے بغیر غالب کی عظمت اور ان کے کام کا درجہ متعین نہیں ہو سکتا۔ غالب کی نثر اور نظم سے عوام و خواص جتنا واقف ہوں گے اسی قدر غالب کی ہمہ گیری اور مقبولیت میں اضافہ ہوگا۔

اس سلسلے میں جو کام ابھی کئے جانے کے لائق ہیں ان کی فہرست اگرچہ طویل ہے لیکن بعض اہم اور بنیادی باتیں درج ذیل کی جاتی ہیں۔

(۱) مکاتیب غالب کی مدد سے ایسے نثری نمونے یکجا کرنا جن سے غالب کی شاعری کے متعلق ان کے اپنے خیالات کا علم عام ہو سکے۔ اس ضمن میں ان اشعار کی شرح یا معنی جو غالب نے خود تحریر کئے ہیں۔ پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

(۲) دیوان غالب کا ایک ایسا انڈکس مرتب کرنا جس سے کسی ایسے شخص کی الجھن دور ہو سکے جس کے ذہن یا خیال میں ان کے کسی شعر کا محض خاکہ ہو ایسے لمحات خاص سے پڑھے لکھے اور حافظے کے مضبوط لوگوں پر بھی گزرتے ہیں جب کہ کسی شعر یا مصرع کا محض ایک ٹکڑا یا لفظ ہی زبان و ذہن پر ہو مگر یاد کرنے کے باوجود وہ شعر یا مصرع یاد نہیں آ رہا ہو۔ یہ لمحہ جس الجھن اور پریشانی کا ہوتا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ جیسے کسی کے خیال میں صرف ندیم دوست، بوئے دوست یا صرف لفظ دوست ہو اور پورا شعر یاد نہ آ رہا ہو۔ ایسی صورت میں اس کے ہیجان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں انڈکس اس کی مدد کر سکتا ہے جیسے فہرست مضامین اس کتاب کے تمام موضوعات کو یک نظر سامنے لے آتی ہے۔ انڈکس میں ہر ردیف کے ہر شعر کو ایک نمبر دیدیا جائے گا اور لفظ یا جملے کے ٹکڑے کو مدنظر رکھ کر اس نمبر کی نشاندہی کر دی جائے گی۔ اب دوست کا لفظ اگر فرض کیجئے پورے دیوان غالب میں پندرہ جگہ آتا ہے۔ تو ان اشعار کے نمبر درج کر دئے جائیں گے۔ لہذا مذکورہ بالا لفظ یا ٹکڑے کو مدنظر رکھ کر وہ اصل شعر اس طرح ہوگا

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغول حق ہوں بندگی بو تراب میں

یہ کام نہایت دقت طلب اور دشوار و طویل ہے لیکن قاضی عبدالودود اور محترم عرشی رامپوری صاحب کے مشورے سے یہ مشکل آسان کی جا سکتی ہے۔

(۳) غالب پر جتنے لوگوں نے کام کئے ہیں ان کی تعداد کچھ زیادہ طویل نہیں ہے۔ پھر بھی عہد غالب سے غالب صدی تک جس قدر کام ہوا ہے۔ اس کی مکمل فہرست معہ ضروری حواشی کے مرتب ہو جانا چاہئے۔ عنوانات اس طرح مقرر کئے جا سکتے ہیں۔

نام مضمون نگار، عنوان، نام رسالہ یا کتاب، سن اشاعت ملنے کا پتہ، حواشی میں اگر اس مضمون پر اختلاف رائے پیش ہوا ہو تو اس کی نشاندہی بھی ساتھ ہی ساتھ کی جائے۔ ایسے مفید کام کے لئے ہم اس کو "غالبیہ" کا عنوان دے سکتے ہیں۔

(۴) اردو کے بہت سے ادیب اور مضمون نگار ایسے ہیں جنہوں نے کسی اور شاعر یا ادیب پر مضمون لکھا ہے لیکن برائے بیت یا تقابل کے طور پر غالب کا ذکر کیا ہے۔ یا ان کا کوئی شعر یا اس کا جزو استعمال کیا ہے۔ ایسے تمام مضامین کی نشاندہی ہو جانی چاہئے جس سے یہ منتشر اجزا ایک جا ہو جائیں۔

(۵) بہت سے ایسے ادیب اور شاعر ہیں جنہوں نے اپنے خطوط میں غالب کے اشعار یا مصرعے یا ان کے کسی فقرے کو اپنے طور پر استعمال کیا ہے۔ امکانی حد تک ان کی نشاندہی اور واقفیت کر لینی چاہئے۔

(۶) غالب کے تمام مطبوعہ دواوین اور ان کی شرحوں کے نسخے بھی یکجا کر لینے چاہئیں۔

(۷) غالب کے اشعار کے لفظی و حرفی معنوں کے سوا "خاموش معنی" بھی ہیں۔ بعض مصرعے ایسے ہیں جو زبان زد خاص و عام ہیں۔ امثال اور محاورے کے طور پر بھی مشہور ہیں۔ ان کی ترتیب کا کام بھی ہو جانا چاہئے۔

(۸) ۱۹۰۶ء میں لکھنؤ سے ایک تار سید آل حسین صاحب بلگرامی نے کوانہ ضلع آرہ (شاہ آباد) بہار بھیجا تھا جس میں اپنے ایک عزیز خاص کی شرکت شادی میں نہ کرنے پر شکایت مطلوب تھی۔ بزرگی و خوردی کا برتاؤ اور بھرم بھی باقی رکھنا تھا۔ اس لئے اپنے سے چھوٹے سید محمد محسن بلگرامی کو یہ پیغام بھیجا۔

تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی
ہاں مگر چین سے بسر نہ ہوئی

اس طرح کے واقعات بہت سے ہوئے ہیں اور آئندہ ہوں گے۔ اس لئے اس طرح کے اشعار جن سے اپنا مدعا ادبی طرح بیان کیا گیا ہو اگر جمع کر لئے جائیں تو خوب ہو یا بارنیشٹ

اور اسمبلی ہاؤس میں جن ممبران نے اشعار کی مدد سے اپنا مدعا بیان کیا ہو۔ ان کو یکجا کر لینا بھی بڑی خدمت ہوگی۔

(۹) غالب کے بہت سے اشعار ایسے ہیں جن کو ہم آپ طنز یا مزاح کے طور پر استعمال کرتے ہیں، ایسے مزاحیہ یا طنزیہ اشعار یا مصرعے یکجا کرنا بھی ضروری ہیں۔

(۱۰) غالب کی غزلوں پر جن شعراء نے تضمینیں کی ہیں ان کی ترتیب ہو جانی چاہئے، یہ کام تلاش و محنت کا ہے پرانے اور قدیم رسالوں کی خاک چھاننی ہوگی، مگر یہ کام کر لینا چاہئے۔

(۱۱) بہت سے ایسے حضرات ہوں گے جنھوں نے غالب پر کچھ لکھا ہو، مگر اپنی بے بضاعتی یا مجہول طبیعت ہونے کی بنا پر منظر عام پر نہ لا سکے ہوں گے، ایسے تمام افراد کی حوصلہ افزائی اور ہمت افزائی کرنی چاہئے۔

(۱۲) غالب اکاڈمی، کو غالب کے سلسلے میں ہر زبان کی ان اشاعتوں اور اشتہاروں و کتابوں کو جمع کر لینا چاہئے جن دسترس ہر شخص کے امکان میں نہیں ہے، اسی طرح دنیا کے جن جن ممالک نے غالب سے متعلق مقالے مضامین، فیچر، تقریریں اور مباحثے کئے ہیں ان کو حاصل کرکے اردو زبان میں منتقل کرنے کی سعی کرنا چاہئے۔

(۱۳) غالب کے جتنے شاگرد ہیں۔ ان کی تصاویر (نمایاں سائز کی) اور ان کے مختصر حالات جلی حروف میں قلم بند کرا کر "غالب ہال" میں آویزاں کرنا چاہئے، تاکہ لوگ متعارف ہو سکیں کہ غالب سے متاثر ہونے والے کس اقتدار کے لوگ تھے، یہ کام آسان ہے اور چنداں مشکل نہیں۔

(۱۴) غالب کی نادر تحریریں جہاں جہاں بکھری پڑی ہیں ان کو اکاڈمی اپنے اہتمام سے حاصل کرے اور "غالب میوزیم" میں ان کو جگہ دے کر دوامی کر دے۔ (سید مرتضیٰ حسین بلگرامی)

مہاراشٹر اور اردو

اردو کو دوسری زبان کا درجہ دلانے کے لئے راجستھان ہریانہ، یو پی، بہار اور مدھیہ پردیش کا نام لیا جا رہا ہے (چنانچہ اردو کمیٹی نے بھی وزیر اعظم کے نام خط میں ان ہی ریاستوں کا نام لیا ہے) مجھے حیرت ہے کہ آخر مہاراشٹرا کو اس فہرست سے کیوں خارج کر دیا گیا جبکہ وہاں کی دوسری بڑی زبان اردو ہے اور یہی صورت حال آندھرا پردیش کی ہے تو اس معاملہ میں یہ ریاست خوش نام موجود ہے۔

(ابن غوری دکنی)

اردو کی تعلیم اور ترقی کی حوصلہ افزائی کی جائے

رائے بریلی:- وزیر اعظم اندرا گاندھی نے یہاں سٹیج کے روز شمالی ہند کے لوگوں پر دکن کی زبانیں سیکھنے کے لئے زور دیا۔ مسز اندرا گاندھی نے یہاں کملا نہرو نرسری اسکول کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے کہا کہ زبان سیکھنے کے بوجھ میں ہندوستان کے شمال اور جنوب کے لوگوں کو برابر کا حصہ دار ہونا چاہئے تاکہ اس برعظیم کے کسی بھی حصہ کے لوگوں کو یہ خیال دامن گیر نہ ہو کہ وہ گھاٹے میں رہ گئے ہیں۔ وزیر اعظم نے کہا کہ جہاں دکن کے لوگوں کو قومی زبان ہندی سیکھنا ہے وہاں شمالی ہند کے لوگوں پر بھی لازم ہے کہ وہ جنوبی ہند کی زبانیں بھی سیکھیں مسز گاندھی نے یہ بھی کہا کہ اردو پڑھانے اور اس کی خصوصی نشو و نما کی ہر ایک حوصلہ افزائی ہونا چاہئے کیونکہ وہ انتہائی شیریں اور جاندار زبان ہے۔　(سیاست)

سہ لسانی فارمولہ میں تیسری زبان کوئی جدید ہندوستانی زبان ہو

نئی دہلی:- وزیر تعلیم ڈاکٹر وی کے آر وی راؤ نے لوک سبھا میں اس بات کو واضح کر دیا کہ وہ تامل ناڈو میں سہ لسانی فارمولا ٹھونسنے کی کوشش نہ کریں گے اور مرکزی اختیارات کا اس سلسلے میں کوئی استعمال نہ کریں گے۔ موصوف نے کہا کہ ریاست کو بہر حال اس بات کی ترغیب دی جائے گی کہ وہ اسے قبول کر لے۔ ڈاکٹر راؤ نے کہا کہ تعلیم ریاستی مسئلہ ہے اس فارمولا پر عمل کرنا یا نہ کرنا ریاستوں کا کام ہے۔ ڈاکٹر راؤ نے اس تجویز کو قبول نہ کیا کہ ہندی انگریزی کے ساتھ شمالی ہند میں تیسری زبان سنسکرت ہو۔ موصوف نے کہا کہ تیسری زبان کوئی جدید ہندوستانی زبان ہونی چاہئے۔　(ملاپ)

اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا اعلان کیا جائے

نئی دہلی:- ری پبلکن پارٹی آف انڈیا کا ایک وفد یہاں وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی سے ملا۔ اس وفد نے حکومت پر ری پبلکن پارٹی کے ۱۰ نکاتی مطالبات منظور کئے جانے کے لئے زور دیا۔ وفد نے وزیر اعظم کو ایک عرضداشت پیش کی جس میں منجملہ دیگر مطالبات کے یہ بھی شامل ہے کہ جن ریاستوں کے لوگوں کی کثیر تعداد اردو بولتی ہے ان ریاستوں میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا اعلان کیا جائے۔　(سیاست)

شیو پوری میں غالب صدی تقریب

شیو پوری بزم ادب شیو پوری کے زیر اہتمام نگر پالیکا پریشد بھون شیو پوری میں غالب صدی تقریب بصدارت جناب ولور پنڈت کلکٹر ضلع منائی گئی۔ ابتداً جناب صفدر صاحب نے مرزا غالب پر نظم سنائی اس کے بعد جناب ڈاکٹر دھیان چندر صاحب چودھری، جناب ترشی

صاحب ایم۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی وکیل، جناب ڈاکٹر سید وقیع ورھی جی، جناب ماسٹر محمد شفیع صاحب، جناب ڈاکٹر راجندر ناتھ صاحب ڈھینگرا، صدر بزم جناب شیو پوری اور خاور جبل پوری نے مختلف زاویۂ نگاہ سے مرزا غالب کے فن اور حیات پر روشنی ڈالی۔

(خاور جبل پوری)

وزیر اعلیٰ اتر پردیش کی خدمت میں محبان اردو سیتا پور کا وفد

سیتا پور۔ وزیر اعلیٰ اتر پردیش کی سیتا پور میں آمد کے موقع پر محبان اردو سیتا پور کا ایک وفد وزیر اعلیٰ سے ملا اس موقع پر جو معروضات پیش کی گئیں اس کا متن یہ ہے۔ ہم باشندگان سیتا پور کو بے انتہا مسرت ہے کہ آپ ہمارے شہر میں تشریف لائے ہیں اس موقع کو غنیمت سمجھ کر ہم اپنی فریاد آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ آپ ہماری گذارشات کو قبول فرمائیں گے۔ وہ یہ کہ زبان اردو ہمارے اس صوبہ اتر پردیش کی عوامی اور مشترک زبان بھی رہ چکی ہے۔ آزادی کے بعد سے خصوصاً ہمارے اس صوبہ میں اردو کے ساتھ جو ناانصافیاں ہوئی ہیں اس سے اردو داں طبقہ میں سخت بیزاری ہے اردو کا مسئلہ اس وقت تک حل نہیں ہو سکتا جب تک اسے سرکاری زبان کی قانونی حیثیت نہ دی جائے ہندی ہمارے صوبہ کی سرکاری زبان ہے اور رہے گی اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے سے ہندی پر کوئی اثر نہیں پڑتا محض سہ لسانی فارمولا ہی اردو کے مسئلہ کا حل نہیں ہے ہم آپ کی توجہ آپ کے ایک بیان کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں یہ اس وقت کی بات ہے جب آپ چرن سنگھ وزارت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کر رہے تھے۔ "اردو اور ہندی ساتھ ساتھ مڈل کلاس تک پڑھائی جائیں۔ اردو والوں کے جذبات مجروح نہ کئے جائیں" اور اسی موقع پر اتر پردیش کے کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری جناب بنارسی داس جی نے فرمایا تھا "ایک کروڑ سے زیادہ اردو داں لوگوں کو محکوم نہیں بنایا جا سکتا اردو کو دوسری سرکاری زبان بنایا جائے" بحوالہ قومی آواز مورخہ ۳۰ جولائی ۱۹۶۷ء۔ اب آپ خود وزیر اعلیٰ ہیں اس لئے التماس ہے کہ آپ اس مسئلہ کی اہمیت کا بغور مطالعہ کریں گے اور اردو کو قانونی حیثیت سے دوسری سرکاری زبان تسلیم فرمائیں گے۔

حیدرآباد میں "سائے کا سفر" کی رسم اجرا

حیدرآباد۔ حلقہ فکر و نظر کے زیر اہتمام منعقدہ ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے ایک اجتماع میں مشہور نقاد پروفیسر آل احمد سرور نے ممتاز افسانہ نگار عوض سعید کی کہانیوں کے پہلے مجموعہ "سائے کا سفر" کی رسم اجرا نمائش کلب میں انجام دی۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر انور معظم نے کہا عام افسانہ نگار اپنی کسی خامی کو پورا کرنے کے لئے پلاٹ اور تحیر انگیز اختتام کے سستے حربوں کا استعمال کرتا ہے لیکن عوض کے یہاں یہ لالچ نہیں ہے۔ ان کی کہانیوں کا پلاٹ انتہائی سادہ ہوتا ہے وہ اپنے کردار بھی بڑی سادگی سے پیش کرتے ہیں اور اپنے واقعات بھی روزمرہ زندگی سے چنتے ہیں اور ان کے یہاں مجموعی حیثیت سے ایک ضبط اور ٹھہراؤ ملتا ہے۔ وہ غیر ضروری عجلت سے کام نہیں لیتے فضا سازی پر جو افسانے کی بنیادی ضرورت ہوتی ہے عوض سعید نے بھرپور توجہ دی ہے جس سے کہانی پر اثر بن جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں انور معظم نے عوض سعید کی دو کہانیوں "کھلونے کا غم" اور "پہلی تنخواہ" کے اقتباسات پڑھ کر سنائے۔ ڈاکٹر انور معظم نے کہا کہ عوض سعید نے اپنے نام کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے کوئی شعوری کوشش نہیں کی ہے وہ کسی مخصوص گروہ میں شامل نہیں رہے لیکن اس کے باوصف ان کی کہانیاں بلاشبہ ان کے وجود کو منواتی ہیں۔ شاذ تمکنت نے عوض سعید کو "سائے کا سفر" کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہانی کے دشت امکان کا دوسرا قدم ڈھونڈنے والوں میں عوض سعید کا نام بھی شامل ہے کہانی جو پریم چند کے دور سے آگے بڑھی۔ منٹو، کرشن، اوپندر ناتھ اشک، بیدی اور غلام عباس کی فنکارانہ منزلوں سے گزرتے ہوئے اب جس نہج پر رواں دواں ہے اس کے مستقبل کے بارے میں تو کچھ کہا نہیں جا سکتا کیونکہ ادب میں پیشین گوئیاں یوں بھی خطرناک ہوتی ہیں لیکن شفق کے رنگوں سے طلوع صبح کی بشارت ضرور دی جا سکتی ہے۔ چنانچہ مجھے یہ کہنے دیجئے کہ نئی کہانی اپنے اندر بڑے امکانات رکھتی ہے یہ کہانیاں ایک SUDDEN SHOCK کا سا احساس رکھتی ہیں۔ عوض سعید کی نئی کہانیاں "دوسری موت"، "کتبہ"، "تیسرا شکست"، "گلاب اور صلیب"، "سائے کا سفر" نہ صرف عوض کی گوناگونی کو ظاہر کرتی ہیں بلکہ نئی کہانی کے امکانات کی طرف واضح

اشارے کرتی ہے دکھائی دیتی ہے ان میں سے بیشتر کہانیاں ABSURDITY کی عمدہ مثالیں ہیں پروفیسر عالم خوندمیری نے اپنی مختصر سی تقریر میں کہا کہ عوض سعید کی کہانیوں کا یہ مجموعہ ان کے فنی سفر کی تمام منزلوں کی نشاندہی کرتا ہے خاص طور پر اس مجموعہ کے آخر میں شامل افسانے "کتبہ" "تیسرا تخت" اور "سائے کا سفر" کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر عالم خوندمیری نے کہا کہ یہ کہانیاں عوض کے رجحان میں ایک خوشگوار تبدیلی کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ عوض سعید کے افسانوں میں طرز بیان کی ندرت، اور جدیدیت پائی جاتی ہے جو ان کے شاندار مستقبل کی ضمانت ہے ڈاکٹر مغنی تبسم نے کہا۔ نفس انسانی کی الجھی اور سربستہ کیفیات، اس کے تجربوں اور موجودہ عہد میں انسانی زیست کی بے ڈھب صورت حال کو انھوں نے بعض کہانیوں میں بڑی فنکاری اور خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ وہمی تمثیلوں (FANTASIES) اور نفسی علائم کے استعمال سے ان کہانیوں میں ایک پراسرار فضا پیدا ہوگئی ہے جیسے سائے کا سفر، دوسری موت اور "تیسرا تخت" عوض سعید کے یہ تجربے جدید افسانے میں اظہار کے نئے امکانات کی دریافت اور تلاش کی ایک کڑی ہے یہ سفر غیر مختتم ہے شاید اس کی کوئی منزل نہیں ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے خاص طور پر عوض سعید کی بعض کہانیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ انھیں پڑھتے ہوئے ایک عجیب "تعجب انگیز مسرت" کا احساس ہوا۔ انھوں نے کہا اپنی چھوٹی سی کہانی "کتبہ" میں عوض سعید نے کوئی تعین نہیں کی ہے کوئی وعظ دیا ہے نہ لکچر بازی کی ہے لیکن اس کے باوجود بڑی خوبی کے ساتھ ایک مخصوص میلان اور ایک روش کو بڑی خوبصورتی سے گرفت میں لیا ہے انھوں نے کہا کہ بے رحم حقیقت نگاری اس دور کی حقیقت ہے جہاں روشنی اور سائے ایک عجیب دھندلکے کی سی کیفیت پیدا کر رہے ہیں۔

(بشیر انور)

ادارۂ تجدید ادب بھوپال کا اکتیسواں ماہانہ طرحی مشاعرہ

بھوپال، ۱۰ر اپریل یہاں سیٹھ حاجی محمد عیسیٰ بھائی کی رہائش گاہ (نگی ہاؤس) میں ادارۂ تجدید ادب بھوپال کا اکتیسواں ماہانہ طرحی مشاعرہ منعقد ہوا۔ جس کی صدارت مدھیہ پردیش کابینہ کے وزیر محمد بشیر خاں صاحب نے فرمائی۔ مشاعرہ میں بھوپال کے مختلف مکتبۂ فکر کے تقریباً اٹھائیس شعراء نے اپنی طرحی غزلیں سنائیں۔

(سید اختر علی اختر)

اردو کو دوسری سرکاری زبان نہیں بنایا جائے گا

نئی دہلی ۱۰- ہندی ریاستوں کے کانگریسی وزراء نے یہاں ہندی میں یکسانیت پیدا کرنے کے سوال پر غور و خوض کیا یہ میٹنگ وزیر اعلیٰ یوپی جناب گپتا کی تحریک پر طلب کی گئی۔ اس میں راجستھان، ہریانہ اور ہماچل پردیش کے وزراء شریک تھے۔ جناب گپتا نے بعد میں اخباری نمائندوں سے گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ ایسے الفاظ کا بھی مختلف ترجمہ کیا جاتا ہے۔ جو عام طور پر بولے جاتے ہیں انھوں نے بعض حلقوں کی دوسری زبانوں سے الفاظ حاصل نہ کرنے کے رجحان کی مخالفت کی۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ اترپردیش میں اردو کو دوسری انتظامی زبان نہیں بنایا جائے گا لیکن تعلیمی اداروں میں اس کی حیثیت تیسری زبان کی ہوگی۔ جناب کامراج جیسے اشخاص تک نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ہندی کے علاقوں میں طلبہ کو انگریزی، ہندی اور اردو پڑھنی چاہئے جناب گپتا نے کہا کہ اب تک سنسکرت کو تیسری زبان کی حیثیت سے لینے کا رجحان ہے لیکن آپ نے امید ظاہر کی کہ اردو کو تیسری زبان کے طور پر پڑھنے کی جو حوصلہ افزائی کی گئی ہے اس میں کامیابی ہوگی انھوں نے وضاحت کی کہ تیسری زبان کی تعلیم ضروری قرار دی گئی ہے لیکن کوئی خاص زبان ضروری قرار نہیں دی گئی ہے۔

(الجمعیۃ)

غالب سرانی اور پرویز شاہدی رینج

کلکتہ، ۱۰ انجمن ترقی اردو مغربی بنگال کی تحریک پر کلکتہ کارپوریشن نے کلکتہ کی مشہور شاہراہ فری اسکول اسٹریٹ کا نام مرزا غالب سرانی اور مرکس رینج کا نام پرویز شاہدی رینج میں بدل دیا ہے۔ ہم اراکین انجمن اور تمام اردو دوستوں کی طرف سے اس مستحسن اقدام پر کلکتہ کارپوریشن کے میئر صاحب و تمام کاؤنسلر حضرات کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور تمام اردو دوست حضرات سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ ان ناموں کو ہر ممکن طریقہ سے مروج کرنے کی کوشش کریں۔

(اعزاز افضل)

اردو ادیبوں کو ریاستی انعامات

لکھنؤ، حکومت اترپردیش نے ادیبوں کے انعامات کا اعلان کیا۔ ۱۰ ہزار روپیہ کا سب سے بڑا انعام ہندی کے ادیب جناب ویوگی ہری کو ہندی ادب میں ان کی خدمات کے صلہ میں دیا گیا ہے۔ ۷۰ دوسرے ادیبوں کو جن میں ہندی کے ۴۹ اردو کے ۸ اور سنسکرت کے ۲۶ ادیب شامل ہیں اردو کا سب سے بڑا انعام جس کا نام غالب انعام ہے لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی کے استاد ڈاکٹر نیر مسعود کو ان کی کتاب "رجب علی بیگ سرور: حیات و کارنامے" پر دیا گیا ہے اس کی رقم ایک ہزار روپیہ ہے دوسرا انعام جو اکبر الہ آبادی انعام کہلاتا ہے بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر امرت لال عشرت کو ان کی کتاب "ایران صدیوں کے آئینے میں" پر دیا گیا ہے اس کی رقم بارہ سو روپیہ ہے

نام پر سادہ کل انعام سید صباح الدین عبدالرحمٰن (دارالمصنفین، اعظم گڑھ) کو ان کی کتاب عہد مغلیہ مسلمان و ہندو مورخین کی نظر میں ۸ سو روپیہ کا دیا گیا ہے اس کے علاوہ متفرق اردو انعامات جو ہر ایک ۵ سو روپیہ کا ہے جناب شہاب جعفری (دہلی) کی کتاب سورج کا شہر جناب طالب چے پوری (الہ آباد) کی کتاب گل صحرا، ڈاکٹر عبدالودود خاں (اجین) کی کتاب اردو نثر میں ادب لطیف جناب عرش ملسیانی (دہلی) کی کتاب شرر سنگ اور جناب نازش پرتاب گڑھی کی کتاب زندگی سے زندگی کی طرف کو دیے گئے ہیں۔

(قومی آواز)

کرسیاں

"اردو ادب ۱۹۶۸ء شمارہ ۴ میں زاہدہ زیدی کا اونیسکو کے ڈراما 'CHAIRS' کا ترجمہ شائع ہوا ہے اس کا آخری حصہ چھپنے سے رہ گیا تھا، جو درج ذیل ہے۔ اردو ادب کے اگلے شمارے میں بھی اس کا اعلان ہوگا۔" (ادارہ)

بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت اپنی اپنی طرف کی کھڑکیوں سے نیچے کود جاتے ہیں۔ ان کے پانی میں گرنے کی آواز آتی ہے۔ اس کے بعد ایک لمحہ مکمل خاموشی رہتی ہے۔ اس کے بعد مقرر بن دیکھے مجمع سے مخاطب ہوتا ہے اور کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن اس کے منہ سے صرف بے معنی آوازیں نکلتی ہیں وہ ہاتھ کے اشاروں اور ان آوازوں کے ذریعے حاضرین کو سمجھانا چاہتا ہے کہ وہ گونگا اور بہرا ہے اور پھر وہ مایوس اور پریشان سا ہو کر چاروں طرف دیکھتا ہے اور پھر جیسے یکایک اس کے دماغ میں کوئی خیال آتا ہے اور وہ چاک سے تختۂ سیاہ پر کچھ لکھتا ہے، وہ تحریر کچھ اس قسم کی ہے۔ آ ــ با ــ جا ــ شن ــ تی ــ وغیرہ اس کے بعد وہ حاضرین کی طرف دیکھتا ہے اور ہاتھ کے اشارے سے معلوم کرنا چاہتا ہے کہ وہ سمجھے یا نہیں، اس کے بعد وہ مایوس ہو کر یہ حروف مٹا دیتا ہے اور کچھ اور لکھتا ہے وہ تحریر کچھ اس طرح ہے۔ آ مس ــ ما ــ نی ــ خدا ــ بن ــ تی ــ شا ــ شا ــ وغیرہ اور پھر بڑے اطمینان سے مجمع کی طرف دیکھتا ہے۔ ڈائس سے نیچے اترتا ہے شہنشاہ کی کرسی کے سامنے جھکتا ہے اور صدر دروازے سے چلا جاتا ہے اس دوران میں روشنی رفتہ رفتہ کم ہو رہی ہے اور جس وقت مقرر باہر جاتا ہے اس وقت اسٹیج نیم تاریک ہے مقرر کے جانے کے بعد ایک لمحہ مکمل خاموشی رہتی ہے اور پھر یکایک بن دیکھے مجمع کے شور اور تمسخر آمیز ہنسی کی آوازیں آتی ہیں۔ پردہ گرتا ہے

باقی صفحہ سے آگے

کی گئی تھی۔

اس اخبار کے مضمون نگاروں میں اگر ایک طرف سرسید، حالی، ڈپٹی نذیر احمد، سید محمود، راجہ جے کشن داس، نواب شرف الملک، ماسٹر رام چندر، منشی پیارے لال اور بہاری چندر و ہرش چندر دکھائی دیتے ہیں تو دوسری طرف گزٹ میں دادا بھائی نوروجی، سریندر ناتھ بنرجی، سر آکلینڈ کالون، اے جے میکڈانلڈ، ولیم میور، کرنل گرام، گارساں دتاسی وغیرہ کے بھی نام ملتے ہیں۔

جام جہاں نما سے لے کر اخبار سائنٹفک سوسائٹی تک اردو صحافت نے ترقی کے کئی مراحل طے کئے ہیں لیکن گزٹ کے سرتاپا مجتہدانہ انداز کا تذکرہ صحافت کی ہر تاریخ میں ضروری ہوگا۔ اس اخبار نے کسی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی بات میں بھی کسی کی تقلید نہ کی بلکہ اتباع کے لئے خود اپنا نمونہ پیش کیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں، اسلوب ہی میں نہیں بلکہ نام میں بھی اس اخبار کی تقلید کی گئی۔ اس نے نہ صرف یہ کہ ہندستانیوں کو کورانہ تقلید سے باز رہنا سکھایا بلکہ انھیں بصیرت دی حوصلے دیئے ولولے دیئے انھیں بھی بتایا کہ اگر جینا ہے تو آبرو کے ساتھ جیو۔ یہی وہ اخبار ہے جس نے انیسویں صدی میں صحافت کو قومی زندگی کا ترجمان بنا دیا۔ مقصد اور صحافت کے درمیان جو خلیج تھی اسے پر کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اردو نثر کو زمانے کا ساتھ دینے اور وقت کے چیلنج کو قبول کرنے کا ڈھنگ بتایا۔ اس اخبار کے مضامین سے انیسویں صدی کی سیاست کے سمجھنے کے لئے جو مستند مواد ملتا ہے اس کا ملنا کسی اور ذریعہ سے ممکن نہیں۔ نیز سرسید کے سلسلے میں لوگوں نے جو بے بنیاد نظریات قائم کئے ہیں ان کی بھی تردید ہوتی ہے اور یہ شدید احساس ہوتا ہے کہ سرسید کے بارے میں ہم کو مکمل معلومات نہیں ہے۔

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر و پبلشر سید بشیر علی نے منیو کار پریس علی گڑھ میں چھپایا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا